اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ کا تصوّر

(ایک تقابلی جائزہ)

سلیم طارق خان ایم اے

جہاں تک علم و حکمت اور آداب زندگی کا تعلق ہے ماقبل مسیح کا یونان آج کے تہذیب یافتہ یورپ سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ ۲۰۰۰ قبل مسیح کا جزیرہ کریٹ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا گہوارہ تھا۔ ایتھنز کی تہذیب نے سولن جیسا مدبر تاریخ کو دیا۔ چوتھی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان کی تہذیب اپنے عروج پر تھی اور یونان علم و حکمت، فہم و فراست سیادت و سروری اور ادب و فن کا مرکز تھا۔ یہی زمانہ ہے جب سقراط، ارسطو اور افلاطون جیسے یکتائے روزگار فلسفی پیدا ہوئے جو آج بھی مغربی تہذیب کو فکری بنیاد فراہم کرنے کے باعث زندہ ہیں۔ انہوں نے ہی قانون کی حاکمیت کا نظریہ پیش کیا۔ اسی یونانی تہذیب نے مصر کو یونان ثانی اور روم کو رومۃ الکبریٰ کی عظمت عطا کی اور عالمگیر قیادت و سیادت کا شعور بخشا۔ اس مادی اور فلسفیانہ تہذیب میں مذہب کے خلا کو عیسائیت نے پہلی صدی عیسوی میں پُر کیا۔ خود یونان بھی مذہبی ہدایت سے محروم ہونے کے باوجود اخلاق کے تصور سے یکسر بیگانہ نہ تھا۔ بلکہ یہیں سے زینو جیسا فلاسفر پیدا ہوا جس نے رواقی فلسفۂ اخلاق کو جنم دیا۔ یہ فلسفہ تیسری صدی قبل مسیح سے دوسری صدی عیسوی تک مقبول مکتب فکر رہا۔

لیکن یہ تمام تر تہذیبی ارتقاء اس عروج کو پہنچ جانے کے باوجود رومۃ الکبریٰ کی تہذیب کو اپنے ہی ایک مورخ اور فلسفی "گبن" کے اس تبصرے سے نہ بچا سکا کہ "تاریخ کے اتنے عرصہ میں

قباحتوں کی کثرت اور محاسن کی کمی کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی"۔ آخر اس کا سبب کیا تھا۔ ہم اس کا باعث اس تہذیب کی، ابدی حقیقتوں سے روگردانی، کو قرار دیتے ہیں۔

بعد ازاں اس تہذیب کا قاتل قیصر روم "ہرقل" قرار پاتا ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط موصول ہو جانے، آپ کے پیغام حقانیت کی تصدیق کرنے، آپ کے ساتھ اظہار نیاز مندی کرنے اور یہ کہنے کے باوجود کہ

"اگر یہ باتیں سچ ہیں تو خدا کی قسم! میرے پاؤں تلے کی مٹی تک وہ قابض ہو جائے گا۔ کاش میں اس وقت اس کے پاس جا سکتا اور اس کے پاؤں دھوتا"۔

اس کے بعد بھی وہ قبول حق سے محروم رہا۔ یہ تاریخ کا نہایت اندوہناک موڑ تھا جس نے روم کے نام نہاد تہذیب یافتہ تمدن کو DARK AGE کی طرف دھکیل دیا۔ قیصر اس ذات برحق کے بارے میں حقیقت کے ادراک کے باوجود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جگہ مغربی اور یورپی تہذیب کے فرزند کو اس منصب جلیلہ پر فائز دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ نیشنلزم مغرب کے تہذیبی ارتقاء میں مستقل بالذات فلسفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب کی "DARK AGE" کا ذمہ دار قیصر ہے جس نے صرف اور صرف ذاتی اقتدار، خودغرضی اور درباریوں کی خوشنودی کی خاطر حق کو قبول نہ کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خط اور پیغام میں واضح طور پر فرمایا تھا۔

"دین اسلام کو قبول کر لو، تم اور تمہاری ملت فلاح پا جاؤ گے اور اگر اس دعوت کو قبول نہیں کرو گے تو اپنا اور ساری عیسائی ملت کا وبال تم پر ہوگا"۔ آپ نے قیصر کو عیسائی دنیا کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے مخاطب فرمایا کیونکہ اس وقت کے دستور کے مطابق بادشاہ کا مذہب ہی عوام کا مذہب ہوتا تھا۔ اس لئے قیصر کا دین کی دعوت کو ٹھکرانا، لاکھوں افراد کو ہدایت سے محروم کر دینے کے علاوہ ان کے تہذیبی زوال کا پیش خیمہ تھا۔

آپ کی دعوت اس حاکمیتِ الٰہیہ کی طرف تھی جس کا اقرار عیسائی بھی کرتے تھے۔ لیکن مرور ایام

اور نفسانی خواہشات کے سبب تثلیث کے عقیدے نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی حقیقی ہیئت کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اسی لئے قرآن پاک نے اہل کتاب کو دعوت دی تھی۔

قل یا اھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃ سواءِ بیننا و بینکم الّا نعبد الّا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابًا من دون اللہ۔ (آل عمران)

اے اہل کتاب! آؤ کیوں نہ ہم ایک ایسے کلمہ پہ جمع ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔ یعنی ہم اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں نہ ہی اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہی ہم میں سے کوئی کسی کو اپنا رب بنائے۔

لیکن اس دعوت کو قبول کرنے میں ان کی ذاتی قیادت وسیادت معرض خطر میں تھی۔ ان کی وہ حیثیت برقرار نہیں رہ سکتی تھی جس کے تحت ان کا ہر قول قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ ان کی نفسانی خواہشات کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی جن کے وہ بندے اور غلام بنے ہوئے تھے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ خط قیصر کو اس وقت دیا گیا جب وہ ایران سے جنگ کے بعد فتح کا جشن منا رہا تھا اس نے راہ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسی دن سے یونانی فلسفے اور عیسائی عقیدے کی بنیاد پہ اٹھائی گئی تہذیب اپنے زوال کی طرف تیزی سے بڑھنا شروع ہو گئی۔

کسی بھی تہذیب کے عروج و زوال میں سیاسی نظم وضبط، اور افکار و خیالات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور حکمرانی واقتدار کا بنیادی فلسفہ ہی اس کے تہذیبی خطوط متعین کرتا ہے۔

یونانی تہذیب میں ریاست کا تصور:۔ ریاست کی فلسفیانہ توجیہات سب سے پہلے یونانی افکار میں ملتی ہیں، جہاں ریاست اپنے دور کے مطابق جدید ترین خطوط پہ استوار رہی اس وقت کے نامور مفکرین میں سقراط، افلاطون، ارسطو اور گلاکون وغیرہ شامل ہیں جنہیں آج بھی مغرب میں بابائے فلسفہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے ریاست کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

افلاطون نے ایک ایسی مثالی مملکت کا تصور پیش کیا جہاں اچھائیاں ہی اچھائیاں ہوں، الف

کے تقاضے مکمل طور پر پورے ہوں۔ اس کی نظر میں ریاست کا سب سے بڑا منصب، یعنی حکمرانی و اقتدار، فلسفی کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے کیونکہ فلسفی "فہم و ادراک، عقل سلیم اور وجدان کے نہایت اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے۔ وہ فکر صحیح پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک فلسفی مکمل جوش اور جذبے سے سچائی کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اس کی وسعت نظر اس کو فکر تو سے نوازتی ہے"۔ لیکن وہ اس بات کی ضمانت دینے سے قاصر ہے کہ فلسفی واقعی راست فکر ہوگا۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک فلسفی عوام کے مکمل مسائل کی تہہ تک پہنچ کر ان کا حل ڈھونڈ سکتا ہے۔ یہی اس کی ریاست کا "اقتدار اعلیٰ" ہے۔

افلاطون اخلاق کا زبردست حامی ہے اور تعلیم و اخلاق کے بارے میں اپنا مخصوص نظریہ رکھتا ہے جس میں وہ حکمران اور محکوم دونوں طبقوں کے لئے مختلف نظام ہائے تعلیم تجویز کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انصاف، طاقتور کے مفاد کا نام ہے۔ اس کی ریاست میں عورت اور بچے اسٹیٹ کی میراث ہیں۔

ارسطو کے نزدیک ریاست محض ایک معاشرتی معاہدہ ہی نہیں بلکہ یہ سب سے اعلیٰ و ارفع قدرتی وابستگی ہے۔ اس کی ریاست کی ذمہ داری میں عوام کو انصاف مہیا کرنا، ان کی ضروریات کا خیال رکھنا، ذہنی و جسمانی نشوونما کے مواقع فراہم کرنا، اور ان کے اخلاق سدھارنا شامل ہے۔ اس کے نزدیک ریاست پر افراد کے انفرادی افکار و اعمال اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ وہ نظم حکومت کے لئے مختلف نظاموں کی تجویز پیش کرتا ہے۔

۱۔ ملوکیت (MONARCHY) شخصی حکومت

۲۔ اشرافیہ (ARISTOCRACY) چند منتخب افراد کی حکومت

۳۔ نظم دستوری (POLITY) جمہوری حکومت

ارسطو، حصول اقتدار اور ریاست دونوں کے لئے پیدائش، دولت، محاسن اور آزادی کو بنیاد قرار دیتا ہے۔

ارسطو اپنی کتاب "سیاست" میں اہل یونان کی تکریم کا دعویدار ہے۔ اور تمام دنیا پر حکومت کو

انہی کا حق تصور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک باقی تمام دنیا اہل یونان کی غلام ہے۔ اس نظریہ کو ہ دور کا نازی ازم یا اپنی انتہا میں نیشنلزم بھی کہا جا سکتا ہے۔

افلاطون کے اشراف جن کا حق حکومت محفوظ ہے آج دارالامراء اور دارالعوام کی شکل میں ان میں دیکھے جا سکتے ہیں، جو قانونی گرفت سے بالاتر قرار دیئے گئے ہیں، کیونکہ وہ ملک کے انون بناتے ہیں۔ ان کی روایت کے مطابق کوئی عدالت ان کے نام نوٹس جاری نہیں کر سکتی۔ ن اور بچے کی ریاستی ملکیت آج سوشلزم کی صورت میں رائج بھی ہے۔ انہی نظام ہائے حکومت ربابِ اختیار ان کو جدید ترین فلاسفی کہہ کر دنیا کے سامنے قیادت کا سکہ جمانے کی فکر کرتے ہیں، ہ انہی افکار و خیالات کی حامل سلطنتیں ان کو اپنا کر اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر چکی ہیں۔

روم کے افکار و نظریات :- اہل یونان جدید فکر پیش کرنے میں اہل روم کے پیش رو ، اور اہل روم نے انہی افکار و خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کی۔ ہمیں یونانی افکار اور عیسائیت یدۂ اخلاق ایک دوسرے سے گلے ملے، اور اسی جگہ سلطنت میں عیسائیت کے راستے عقیدۂ بھی داخل ہوا جو آگے چل کر تثلیث میں بدل گیا۔

اہل روم کی اس سلطنت کا آغاز پہلی صدی عیسوی میں اٹلی سے ہوا۔ اور اسی صدی کے م تک یہ لوگ شمالی اور مغربی بربریوں پر قبضہ کرنے کے بعد دریائے فرات تک اپنی سرحدیں ا چکے تھے۔ ان کے فلسفہ حیات اور تصور سیاست میں یونانی اور رواقی اثرات داخل ئے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں غیر رواقی نظریات کے لئے جگہ نہ تھی، اہل روم ریاست ب قانونی حاکمیت سمجھتے تھے۔ سیاسی حاکمیت عوام کے ہاتھ میں تھی۔ بادشاہ عوامی نمائندہ ہوتا ا۔ اس پر اعتماد کرتے ہوئے وہ اسے سرچشمہ قانون قرار دیتے تھے۔ اس کی اطاعت قانون کی عت تھی۔ عوام کی اعلیٰ حاکمیت کی حامل تنظیم سینیٹ اور اسمبلی نے اسے مکمل اختیارات سونپ یئے تھے۔ اس اقتدار کو ایک دفعہ تفویض کرنے کے بعد چھینا نہیں جا سکتا تھا۔ ان کے نزدیک لاب کا کوئی جواز نہ تھا۔ کیونکہ بادشاہ کی حیثیت عوامی نمائندے کی سی تھی۔

بعد ازاں بادشاہ کو عوامی نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ کیونکہ تاجداری اور بادشاہت کو خدائی عنایت قرار دے کر بادشاہ ظل اللہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ رومی حکومت میں عیسائیت کے در آنے کے بعد نظریہ الوصیت نے اپنی حیثیت منوالی۔ اور یہ الوصیت تخت و تاج کے لئے ڈھال قرار پائی۔ اس کے باوجود سلطنت روم کا ایک ہی نعرہ رہا۔

ریاست کا منشاء ——— اس کے عوام کا منشا ہے۔

رفتہ رفتہ نظریہ بادشاہت اس قدر ترقی کر گیا کہ بادشاہ کے لئے یہ تصور پیدا ہو گیا کہ وہ (۱) ریاست کا مختار کل ہے۔ (۲) سب سے بڑا دینی پیشوا ہے۔ (۳) جنگ اور امن کا مختار ہے۔ (۴) اور قوت اس کے لئے ایک عنایت مطلق ہے۔

رومی ریاست کے ڈھانچے میں مذہب کی حیثیت کو سب سے پہلے رومی سینٹ آگسٹائن نے پیش کیا۔ اس کے نزدیک ریاستوں اور سلطنتوں کی تباہی ان کی برائیوں کے سبب ہوتی ہے۔ اس نے تمام دنیا کو عیسائیت کے جھنڈے تلے جمع کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے نزدیک عیسائی دولت مشترکہ قائم کر کے تباہی و بربادی کی پیش بندی کی جا سکتی تھی، اس سینٹ کے نظریہ ریاست کی بنیاد خالصتاً الوصیت پر تھی جس میں انصاف کا دور دورہ ہو اور ایسی سلطنت امن کی علمبردار ہو۔ اس نے کلیسا اور سلطنت کے دو اصولوں پر مشتمل نظریہ دیا۔ اس کے نزدیک کلیسا ریاست کے تابع نہیں ہو سکتا۔ اس کے افکار کو ازمنہ وسطیٰ میں بنیادی حیثیت حاصل رہی۔ گیلاشس GALASIUS کا دو شمشیری نظریہ (TWO SWORDS) اور عالمگیریت UNIVERSALISM بھی آگسٹائن کے خیالات کا ہی پرتو تھے۔

مذہبی حکومت :- مذہبی حکومت کے لئے انگریزی زبان میں THEOCRACY کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ (PRIEST CLASS) خدا کے نام پر اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے۔ ایسے ہی گروہوں کے بارے میں قرآن میں آتا ہے کہ

ان الذین یشترون بعہد اللہ و ایمانہم ثمناً قلیلاً

اور وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ کھاتے ہیں۔

اس تصور کی بنیاد گیلاشس کا دو شمشیری نظریہ ہے جس کے مطابق "اللہ نے پیٹر کو دو تلواریں دیں ان میں سے ایک تلوار روحانی تھی دوسری لادینی، اور پیٹر نے یہ دونوں تلواریں پوپ کو عطا کر دیں۔ اس لئے پوپ زمین پر خدا کا نائب ہے"۔

اس مذہبی حکومت کا آغاز ۴۷۶ء سے ہوا اور یہ حکومت نظریاتی اعتبار سے ایک ہزار سال تک یورپ میں برسر اقتدار رہی۔ اس دور کو یورپ کا تاریک دور "DARK AGE" کہا جاتا ہے، اس دور کی تہذیب یونان و روم کے سیاسی افکار اور عیسائیت کے مذہبی و اخلاقی نظریات اور بربریوں کے تمدن کا آمیزہ تھی۔ یہ دور غیر علمی اور مذہبی اداروں کی سیادت کا دور تھا۔ فکر اور نظریات کی بجائے عبادات نے اہمیت پائی، علوم و افکار پر مذہبی عقیدے کی حکمرانی تھی۔ اس دور کا سیاسی فلسفہ عیسائیت کے مذہبی صحیفوں، ٹیوٹانی عمل، رومن قانون اور یونانی مفکرین کے افکار پر مشتمل تھا جس وقت یہ دور اپنی انتہا کو پہنچا عالمگیر عیسائی شہنشاہیت پر پوپ کا اقتدار مسلط ہو چکا تھا۔ اس دور حکمرانی میں پاپائیت کا ظلم و تشدد قرون اولیٰ کی شہنشاہیت سے کہیں زیادہ تھا۔

مذہبی سیادت نے محکمۂ احتساب کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد لوگوں کو عیسائیت کے افکار سے روگردانی کرنے اور اس کے خلاف سوچنے سے روکنا تھا۔ اس محکمہ کی کارروائیاں آج بھی رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہیں۔ ریاست پر کلیسا کی گرفت جس قدر مضبوط ہوتی گئی اہل کلیسا کی خود مختاری میں اسی قدر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پندرھویں صدی عیسوی تک ان کلیساؤں کے راز دورن خانہ کی نقاب کشائی نہ ہو سکی تھی۔ ۱۲۰۹ء میں کلیسا کے ارباب حل و عقد کی ایک کانفرنس ایوگنون منعقد ہوئی، جس میں کلیسا اور بشپ سے اختلاف رکھنے والوں کی سزاؤں کے بارے میں پوپ کے احکامات کا پابند کیا گیا۔ بعد ازاں ۱۲۱۵ء میں عیسائی حکمران بھی اس حلف میں شریک کر لئے گئے، اس اقدام سے پوپ نے بیک قلم عوام کو ان کی آزادی اور حکمرانوں کو ان کے اختیارات سے محروم کر دیا۔ مونٹانو نے سب سے پہلے انکوزیشن کا پردہ چاک کیا۔ اس کی کتاب ۱۵۶۷ء

میں ہائیڈل برگ سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ لیگرانو جو کہ اس محکمہ احتساب کا جنرل سیکرٹری رہ چکا تھا اس کے گھناؤنے اقدامات کو منظر عام پر لانے میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے یورپی ادب میں اس محکمہ کی کارگزاریوں کی مکمل روداد دیکھی جا سکتی ہے۔ محکمہ احتساب کے کارندوں کے لئے یہ اطلاع کافی تھی کہ ایک فرد دل سے عیسائی نہیں جادوگر ہے یا اس نے واجبات مکمل ادا نہیں کئے ہیں۔ اس کے لئے خفیہ اطلاع کافی سمجھ جاتی تھی، کسی فرد کا گھر سے اچانک غائب ہو جانا اہل خانہ کی اطلاع کے لئے کافی تھا کہ ان کا آدمی انکوزیشن کی زد میں آگیا ہے۔ اقرار جرم کے لئے سزاؤں کی چودہ اقسام تھیں اور اقرار جرم کے بعد زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ صرف سپین میں زندہ جلائے جانے والوں کی تعداد ۳۱۲۱۲ تھی۔ ایک اندازے کے مطابق مغربی یورپ اور برطانیہ میں زندہ جلائے جانے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ یہی وہ تھیا کریسی ہے جس سے آج کا یورپ خوف زدہ ہے۔

انسان، انسانیت کے نام پر عوام الناس کا مقتدر اعلیٰ بنے یا خدا کا نام لے کر خود قوانین وضع کرنے کا اختیار حاصل کرلے، بے چارے عوام کے لئے تباہی و بربادی ہی مقدر بنتی ہے۔ کیونکہ انسان قانون سازی کے اختیار سنبھال لینے کے باوجود، خودغرضی، محبت نفرت اور عصبیت کے جذبات کو اپنی فطرت سے خارج نہیں کر سکتا۔ اور انسانی فطرت کے ان مظاہر کے پس منظر میں تیار ہونے والا کوئی قانونی ڈھانچہ تمام انسانوں کے لئے فلاح و بہبود بھائی چارے اور مساوات انسانی کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

قدیم یونان، روم یا مصر ہو، ازمنہ وسطیٰ کی مذہبی سیادت ہو، یا جدید دور کا نیشنلزم اور سوشلزم، اپنی بنیادی فکر میں یہ سب ایک ہی ہیں۔ فرعون خدائی و ربوبیت کا دعویدار بن کر قانون سازی کے اختیار سنبھال لے، جمہور کی سیادت کے نام پر قانون بنائے جائیں یا خود ساختہ مذہبی اقتدار قانون سازی کا منبع بنیں ان میں سے کوئی انسانیت کی فلاح کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نظریاتی طور پر "الکفر ملۃ واحدۃ" فقط ان کے طریق کار کا اختلاف ان کو "شعوب و قبائل" میں بانٹے ہوئے ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ پارلیمنٹ یا پارلیمان کو ملک کے انسانی سروں کی گنتی

ون سازی کا حق دے دیتی ہے، جس کے باعث وہ کبھی ہم جنسیت (HOMO SEXUALITY) کی
ازت دے دیتی ہے۔ اور کبھی وہ شراب کی تمام تر خرابیوں کو نظر انداز کر کے اس کی بندش کا حکم نافذ
نے کے باوجود پھر اس کی اجازت دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ عوام الناس یہی چاہتے ہیں۔ اور نفسانی
ہش کے تابع ان لوگوں سے کوئی بھی قانون بنوایا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ اس کے
ہیں افراد کی تعداد دوسرے گروہ کی نسبت زیادہ ہو۔ ایک فرد یا چند افراد کی زیادتی و اکثریت ہی
، قانون بنانے کے لئے کافی ہے۔

<u>ریک احیائے علوم</u> :- تحریک احیائے علوم کا آغاز صلیبی جنگوں سے ہوا، یورپ میں ان
لکوں نے نہایت دوررس اثرات پیدا کئے۔ قرون وسطیٰ کا یورپ جہالت اور پس ماندگی کا شکار
ا۔ صلیبی جب اسلامی ممالک میں آئے تو یہاں کے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے
ات قبول کئے۔ جب وہ واپس گئے تو اس نعمت سے تہی دامن نہ تھے، صلیبی جنگوں (۱۰۹۶ء-
۱۲) سے یورپ کی آنکھیں کھلیں اور پس ماندہ مغرب کے تاریک افق پر احیائے علوم کی سحر
ٹ نکلی۔ اس تحریک کو فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) سے مہمیز لگی۔ اور یہ تحریک آگے بڑھتی چلی گئی۔
دازاں مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ - ۱۵۴۶) کی پروٹسٹنٹ تحریک سے اس کو تقویت ملی، کیونکہ
، کے نزدیک صرف انجیل مقدس تمام قوانین کا منبع تھا۔ اس نے روم کے پوپ کی مطلق العنانیت
تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور واضح طور پر کہا کہ ریاست اور کلیسا اپنا علیحدہ علیحدہ وجود
تے ہیں۔ اور انہیں ایک دوسرے کے دائرہ اختیار میں مداخلت کا حق نہیں ہے اور مطلقیتِ
یاست کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے بعد کالون نے بھی اس نظریہ کو پروان چڑھایا۔ اسی دوران میکاولی
سیاسی نظریات نے یورپ کے ریاستی نظام میں بحران پیدا کر دیا۔ اگرچہ تحریک اصلاح کے
ریعے اس کا سدباب کرنے کی کوشش کی گئی اس کے باوجود جمہوری اور انسانی حقوق کا مطالبہ زور
ر شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ عقلیت نے راہ پائی تو CLASS PRIEST نے اسے اپنے خلاف
یا۔ فلسفے اور تعقل کو اپنے دلائل کی بنیاد بنانے والا ہر شخص گردن زدنی قرار دیا گیا۔ اور

محکمہ احتساب کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب دونوں کو ایک دوسرے سے صلح کئے بغیر چارہ کار نظر نہ آیا تو انہوں نے بقائے باہمی اور عدم مداخلت کے اصولوں کے تحت آپس میں ذہنی و نظریاتی سمجھوتہ کر لیا۔ یہاں پاپائیت کے مذہبی قدم رک گئے اور جدید بے دین سیاست آگے بڑھ کر زمام اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینے میں کامیاب ہو گئی۔

مغربی علوم و فلسفہ کی تاریخ میں ڈیکارٹ المتوفی سنہ ۱۶۵۰ء کو بہت اہم مقام حاصل ہے جو فلسفۂ تشکیک پیش کر کے جدید عقلیت پسندی کا باوا آدم قرار پایا۔ اس کے نزدیک کسی شے کے وجود کے لئے خالص مادی شہادتیں اور دلائل ضروری ہیں۔ وہ عرفان حقیقت کے لئے تجربی اور مشاہداتی علم کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد ہوبز نے اس کے افکار کو ترقی دے کر مادیت کے نظریہ میں پیش رفت کی۔ ان دونوں زعماء کے نزدیک مادیت اور ماوراء الطبیعات دونوں علیحدہ اور جدا مقام رکھتے تھے، لیکن اسپی نوزا خالص عقلیت کا علمبردار بنا، یہاں تک کہ مادہ، روح اور خدائی وجود سب خلط ملط ہو کر رہ گئے۔ اس تحریک کے باوجود سترھویں صدی عیسوی میں خدا کا تصور کسی نہ کسی حیثیت میں موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گیلیلیو اور نیوٹن جیسے سائنس دان خدا کے وجود کے منکر نہ تھے۔ لیکن ان کے سائنسی انکشافات کو خدائی تصور سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں فکری تحریک مکمل طور پر مادیت اور لادینیت کے گرد گھومتی رہی۔ اگرچہ ملحدانہ نظریات نے بہت زیادہ اثر و نفوذ قائم کر لیا تھا لیکن فلاسفر خدا کے وجود کا رسمی اقرار کرنے کے باوجود اس کو عملی زندگی کے دائرے سے باہر ہی رکھنا مناسب سمجھتے تھے اور دستوری حاکمیت کی حدود میں در آنے کی اجازت نہ تھی۔ حق اور باطل کا معیار مادیت قرار پایا اور علوم کی تحقیق کے لئے معیار خالصتاً تجربی بن کر رہ گیا۔

ہیگل نے مثالی مادیت کا نظریہ پیش کیا۔ کانٹ نے مادہ و روح کے درمیان اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ خدا کا وجود، روح کی بقا اور ارادے کی آزادی انسانی علم سے ماوراء ہیں۔ اس پر ہم یا تو غائبانہ ایمان رکھیں یا اس کو (PRACTICAL WISDOM) قرار دادی

اسی کے مطابق دائرہ کار متعین کرنا چاہیئے، خدا اور مادی نظریہ کے درمیان اتحاد و اتفاق کی یہ آخری کوشش تھی، لیکن عقل، اپنی خواہشات پر پابندی اور اخلاقی قیود کے لئے خود کو تیار نہ پاکر ان تمام اقدار و روایات سے آزاد ہو گئی۔

انیسویں صدی عیسوی میں علم الحیاتیات وعضویات اور طبقات الارض میں پیش رفت کے باعث خالص افادی نقطۂ نظر نے راہ پائی۔ مادی وسائل کی زیادتی، نئے نئے سائنسی اکتشافات، تجربات و مشاہدات اور ایجادات کے سائے میں ملحدانہ نظریات نے ترقی کی، اور یہ کائنات مکمل طور پر بے خدا و خالق بن کر رہ گئی۔ بلکہ خدا اور خالق کے بارے میں تمام نظریات و اعتقادات کو گمراہ کن قرار دے دیا گیا۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے اس کو مکمل طور پر جڑ سے اکھاڑ پھینکا جس کے مطابق بے خدا و بے خالق کائنات کے نظریہ کے ساتھ ساتھ انسان کی خالص "مادی اور حیوانی" توجیہہ نے اہل مغرب کو تمام اخلاقی حدود و قیود سے آزاد کر دیا۔ اس نظریہ نے مغربی تہذیب کو مادیت، حیوانیت اور لادینیت کی بنیادیں فراہم کیں۔ انسان اور اس کی خواہشات اس کی قوت حاکمہ اور الہ کی حیثیت سے ابھریں۔ مغرب کا جمہوری تصور اپنی انتہا کو پہنچا۔ اس جمہوری تصور میں عوام اور ان کی خواہشات مقتدر اعلیٰ ہیں، عوام ہی ہیئت حاکمہ ہیں اور انہی کے ہاتھ میں قانونی حاکمیت ہے۔ یہ ہے مغرب میں نظریہ اقتدار اعلیٰ کا ارتقاء اور یہی ان کی انتہا ہے۔

اقتدار اعلیٰ :۔ فلسفۂ مغرب کے ارتقائی عمل کو پیش نظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قبل مسیح کا یونان ہی نہیں ازمنہ وسطیٰ، قرون وسطیٰ اور دور جدید میں بھی یہ خطہ سیاسی لحاظ سے مکمل طور پر خواہش نفسانی کے چنگل میں رہا ہے اور اسی نے ان پر حکمرانی کی ہے۔ یورپ میں تصور حاکمیت منطقی نقطۂ نظر سے ایک ہی رہا ہے۔ بادشاہت تھی تو اس نے اپنی مرضی سے قانون بنائے اور نافذ کئے۔ مذہبی حکومت آئی تو خدا کے نام پر چند سر برآوردہ مذہبی زعماء نے اپنے اصول و قوانین وضع کئے، اور آج کا دور تو انسان کی خدائی کا دور ہے اور یہی جمہوریت

ہے، یہی ان کا اقتدار اعلیٰ رہا ہے۔ اس نے سو شکلیں بدلی ہوں روح ایک ہی کارفرما ہے۔

دراصل اقتدار اعلیٰ وہ قوت ہوتی ہے جس کے لئے مکمل اطاعت و فرمانبرداری کا رویہ اپنایا جاتا ہے اور اسی پر اخلاق و تمدن اور سیاست و حکومت کا پورا نظام قائم ہوتا ہے۔

جدید علم سیاسیات کے ماہرین نے حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کے تین شعبے قائم کئے ہیں۔

۱۔ حقیقی حاکمیت۔ PARAMOUNTCY

۲۔ قانونی حاکمیت۔ LEGAL SOVEREIGNTY

۳۔ سیاسی حاکمیت۔ POLITICAL SOVEREIGNTY

اگر ہم ان تینوں شعبوں کو ان الفاظ میں بیان کریں تو ان کا مفہوم ادا کرنے میں آسانی ہوگی کہ حقیقی حاکمیت کے نام اور اس کی منظوری سے قانونی حاکمیت کا ادارہ قانون سازی کرے گا، سیاسی حاکمیت اس کو ریاست میں نافذ کرنے کا فریضہ سرانجام دے گی۔

مغرب میں مجموعی طور پر اقتدار اعلیٰ کا جو تصور رہا ہے اس کو انہی الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے جو ہیوگو گروٹیس نے اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ

۱۔ انسان نے خدا کی رہنمائی یا اس کے احکام کے تحت نہیں بلکہ قطعی طور پر اپنی مرضی اور منشاء کے ساتھ حکومت کی منزل کا تعین کیا ہے۔ کیونکہ انسان نے اپنے تجربے سے یہ سیکھا کہ منتشر کنبے اور بکھرے ہوئے خاندان کسی جارحیت سے خود کو اس وقت تک محفوظ نہیں رکھ سکتے جب تک وہ اکٹھے نہ ہو جائیں۔ لہٰذا وہ ایک معاشرے کی صورت میں متحد ہو گئے اور طاقت کے جواز کے بعد حکومت وجود میں آئی۔

۲۔ ایک حاکمیت یا اقتدار اعلیٰ، کسی بھی اعلیٰ قوی اقتدار، یا پائیت سے آزاد ہے۔

۳۔ ایک حاکمیت دوسری حاکمیت سے بالکل آزاد ہے۔

۴۔ ہر حاکمیت یا اقتدار اعلیٰ تمام امور میں مطلقاً آزاد ہے خواہ یہ امور مذہبی ہوں یا غیر مذہبی۔

۵۔ ہر حاکمیت کو اپنے علاقے کے تمام لوگوں پر مکمل اختیارات حاصل ہیں۔

اقتدار اعلیٰ کے اختیارات :۔ ہوبز نے ریاست کے اقتدار اعلیٰ کو جو اختیارات دیئے ہیں کم و بیش آج بھی وہی ہیں۔ اس نے ریاست معاشرے اور حکومت کے درمیان کوئی تخصیص نہیں کی۔ وہ واقع الامری DEFACTO اور قانونی DEJURE حکومت کو ایک ہی سطح پر رکھتا ہے اور ان میں امتیاز نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک ریاست کی تشکیل انسان کو خطرات سے بچانے کے لئے کی جاتی ہے۔ وہ مقتدر اعلیٰ کو اس قدر اختیارات تفویض کرتا ہے کہ یہ معاہدہ آزادی کی بجائے غلامی کا مظہر بن جاتا ہے۔ وہ اقتدار اعلیٰ کے لئے لیویاتھن LAVIATHAN کا نام استعمال کرتا ہے جس کے معنی دیو پیکر عفریت کے ہیں۔ اس حاکم اور مقتدر اعلیٰ کے اختیارات درج ذیل ہیں۔

۱۔ مقتدر اعلیٰ لامحدود اختیارات کا مالک ہوتا ہے جس پر کوئی شرط عائد نہیں کی جا سکتی ہے

۲۔ مقتدر اعلیٰ کو اختیارات عوام تفویض کرتے ہیں، لیکن چھین نہیں سکتے۔ اس کا کوئی فعل بھی غیر قانونی نہیں ہوتا۔

۳۔ مقتدر اعلیٰ کو قانون بنانے، ٹیکس لگانے اور جنگ کا اعلان کرنے کا اختیار حاصل ہے، وہ منصف ہے۔ اور فیصلے صادر کرنے کے تمام تر اختیارات اسی کے پاس ہوتے ہیں۔ عوام قیام امن کے لئے اس کو اختیارات دیتے ہیں۔ اسی لئے وہ عوام کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ کرنے کا ذمہ دار ہے۔

۴۔ رعایا کو اس کے خلاف احتجاج کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر رعایا عدم اطاعت کا اظہار کرے تو اس کا یہ اقدام نامناسب تصور کیا جائے گا۔

۵۔ اقتدار اعلیٰ اپنے اختیارات کسی دوسرے کو منتقل نہیں کر سکتا۔

مغرب کی لادین سیاست، ملحدانہ فکر اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے اختیارات کی جھلک انگلستان کی شاہی جمہوریت، امریکہ کی صدارتی جمہوریت، اور سوشلسٹ ممالک کی سوشلسٹ جمہوریت میں بدرجۂ اتم دیکھی جا سکتی ہے۔ ان سب ممالک میں طریق کار کا اختلاف ہے، ان میں فلسفہ اور نظریہ ایک ہی کارفرما ہے۔ ان تمام ممالک کو ان کی نظریاتی ہم آہنگی کے پیش نظر اگر الکفر ملۃ

واحدہ" کہدیا جائے تو یہ غلط نہ ہوگا۔

اسلام دنیا کے تمام نظام ہائے زندگی۔ سے مختلف ہے، کیونکہ اسلام اور دوسرے نظاموں میں بنیادی اختلاف نظریہ کا ہے، اسلام، اقتدار اعلیٰ، ریاست، کائنات کی "تاریخی توجیہہ" اور "نظریہ ارتقاء" کے متعلق اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتا ہے جو کسی صورت بھی دوسرے نظاموں سے مطابقت نہیں رکھتا، اس وقت اسلام کے صرف ریاستی نظام کی بنیاد اقتدار اعلیٰ یا حاکمیت حقیقی کے بارے میں بحث کی جائے گی۔ تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اسلام نے دوسرے مختلف ازموں کے مقابلے میں جو اہم نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ اس کی اہمیت و افادیت کیا ہے۔

اسلامی ریاست کے مقاصد و فرائض:۔ قرآن پاک میں مختلف مقامات پر اسلامی ریاست کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ مثلاً سورۃ الحج میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

الذین إن مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر

جنہیں ہم زمین میں اقتدار عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے۔ زکواۃ دیں گے نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روک سکیں گے۔

سورۃ الحدید میں ریاست کے فرائض اس انداز میں ادا کئے گئے ہیں۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید ومنافع للناس۔

ہم نے اپنے رسول روشن دلائل کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے فولاد اتارا جس میں قوت اور لوگوں کے لئے منافع ہیں۔

یہاں پر لوہے سے مراد سیاسی قوت ہے یعنی لوگ اگر بغاوت و نافرمانی اختیار کریں تو بزور قوت دبا دیا جائے امام ابن تیمیہؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

بالقسط فی حقوق اللہ وحقوق خلقہ، وانزلنا الحدید ..... فمن عدل عن الکتاب قوّم بالحدید۔

جو کتاب سے روگردانی کرے تو آہنی ہاتھ سے درست کر دیا جائے۔ ان آیات سے یہ بات

واضح ہے کہ اسلام میں ریاست کے قیام کا مقصد صرف اور صرف حقوق اللہ اور حقوق العباد کی حفاظت ہے، اللہ تعالیٰ نے انہی کا شعور بخشنے کے لئے قرآن پاک کو اتارا اور نظام عدل کو نافذ کرنے کا حکم دیا تاکہ لوگ حق اور انصاف کا ساتھ دیں اور اس پر کاربند ہوں۔

اصول اور ہدایات اتارنے کے بعد ان کے نفاذ کی ضرورت تھی، اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وان اللہ لیزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن" (یہ حدیث ابن قیمؒ نے اپنی کتاب الطرق الحکمیہ فی السیاستہ الشرعیۃ میں بیان کی ہے)۔ یعنی اللہ تعالیٰ حکومت و اقتدار کے ذریعے ان چیزوں کا سدباب کرتا ہے کہ جن کا سدباب قرآن سے نہیں کرتا" یعنی جو برائیاں قرآن کی نصیحت اور فہمائش سے دور نہ کی جاسکیں ان کو ختم کرنے کے لئے حکومت کی طاقت درکار ہوتی ہے،

اسلامی ریاست کے قیام کے مقاصد پر امت کا اجماع ہے۔ تمام ائمہ کرام نے اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ، خدا کی حاکمیت کا اقرار، اس کی اطاعت و فرمانبرداری، مسجد اور معاشرے سے لے کر اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ایوانوں تک ضروری قرار دی ہے، اسی لئے حکومت کا فرض ہے کہ ریاست میں خدا کی مرضی کے احکامات کو نافذ کرنے کا فریضہ ادا کرے۔

امام ابن تیمیہؒ اپنی کتاب منہاج السنۃ (جس کی تلخیص امام ذہبی نے "المنتقیٰ" کے نام سے کی ہے) میں رقمطراز ہیں۔

" فاصلاح الدین والدنیا وقیام الناس بالقسط فی حقوق اللہ والعباد واعلاء کلمۃ اللہ، وھی تعالیم کتابہ والامر بالمعروف والنھی عن المنکر، تلک ھی غایات الدولۃ ومقاصد الولایۃ فی الاسلام"

دین و دنیا کی اصلاح، حقوق اللہ اور حقوق العباد میں لوگوں کو انصاف اور عدل پہ قائم رکھنا، اعلاء کلمۃ اللہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، یہ کتاب اللہ کا منشا ہے اور یہی اسلامی ریاست و حکومت کے قیام کے مقاصد ہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں:۔

"اقول لما کان الامام منصوباً لنوعین من مصالح الدین بھما انتظام الملۃ والمدن وانما بعث نبی صلی اللہ علیہ وسلم لأجلھما والامام نائبہ" (جلد دوم - ۴۲۸)

شاہ ولی اللہ کے نزدیک امامت کا قیام دو مقاصد کے لئے ہے اوّل دینی مصلحتوں کے لئے اور دوم ملت و تمدن کی تنظیم کے لئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی غرض کے لئے مبعوث کئے گئے تھے اور امام آپ کی نیابت کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔"

دینی مصلحت، صرف خدا تعالیٰ کی حاکمیت کو منوانے میں ہے اور انتظام و تنظیم ملت و مدن اس کے احکام کو نافذ کرنے کے لئے ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے بگڑے ہوئے غیر مہذب، غیر متمدن، معاشرے کو تنظیم و ترتیب کی لڑی میں پرو دیا، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پہلے خطاب خلافت میں واضح طور پر فرمایا کہ وہ سربراہ حکومت کے فرائض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے ادا کریں گے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی "اسلامی ریاست" میں رقمطراز ہیں۔ "اسلامی ریاست کے قیام کا اصل مقصد، اس اصلاحی پروگرام کو مملکت کے تمام ذرائع سے عمل میں لانا ہے جو اسلام نے انسانیت کی بہتری کے لئے پیش کیا ہے۔ محض امن کا قیام، محض قومی سرحدوں کی حفاظت، محض عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنا، اس کا آخری اور انتہائی مقصود نہیں، اس کی امتیازی خصوصیت جو اسے غیر مسلم ریاستوں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ ان بھلائیوں کو فروغ دینے کی کوشش کرے جن سے اسلام انسانیت کو آراستہ کرنا چاہتا ہے۔ اور ان برائیوں کو مٹانے اور دبانے میں ساری طاقت خرچ کر دے جن سے اسلام انسانیت کو پاک کرنا چاہتا ہے۔" (صـ۲۱۲)

پس ثابت ہوا کہ اسلام میں ریاست کے قیام کا مقصد اللہ کی حاکمیت کا اقرار، اس کے احکامات کی بالادستی اور ان کا نفاذ ہے۔ تاکہ اس دنیا سے ظلم و جور ختم ہو، طاغوت کی سرکوبی ہو اور عدل و انصاف کا بول بالا ہو، اس کے لئے ریاست کا قیام ضروری ہے۔ جس کے انتظام و انصرام کے لئے انتظامیہ مقرر کی جائے گی۔ فن سیاست کے ماہرین نے حاکمیت کو جن تین شعبوں

میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی حقیقی حاکمیت، قانونی حاکمیت اور سیاسی حاکمیت ۔ ان تینوں شعبوں میں خدا اور صرف خدا کے قانون کی پابندی ضروری ہے۔ حقیقی اور قانونی حاکمیت اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھی ہے اور سیاسی حاکمیت کو مسلمانوں کے سپرد کیا گیا ہے۔ تاکہ دنیاوی نظم وضبط کے لئے انسانی کارندے احکام الٰہی کی رہنمائی میں کام کر سکیں۔ قرآن پاک نے ان تینوں حاکمیتوں کے بارے میں کیا نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔ اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

حقیقی حاکمیت :- قرآن پاک نے حاکمیت کے لئے اِلہ، ملک، سلطان، حکم، اور امر کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

"اِلہ" اِلہ اور رب کے مفہوم میں عبودیت، بندگی، غلامی، اطاعت گذاری اور تابع فرمانی کے لئے ایسی ہستی اور ذات کا اقرار شامل ہے جس کے لئے عبادت وعبودیت اور غلامی وبندگی بجا لائی جاتی ہے، یہی قانون ساز، مالک ومختار ہستی ہے۔ بزعم خود قانون ساز اور مالک مختار ہونے کے ناطے ہی فرعون نے "انا ربکم الاعلیٰ" (میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں) اور ما علمت لکم من اِلہ غیری" (میں نہیں جانتا کہ میرے علاوہ بھی تمہارا کوئی اِلہ ہے) کے الفاظ کہے تھے، کیونکہ ایک حکمران ہی قانون کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ اور جس وقت اسے کسی اور ہستی کا اقرار کرنے کو کہا گیا جو کہ اس کے لئے قانون کی بنیادیں فراہم کرنے والی تھی تو وہ بگڑ گیا۔ قرآن کے یہ الفاظ اپنے وسیع تر مفہوم میں کائنات کے انتظام وانصرام اور اس کے خلق کی ذمہ دار ہستی کا اظہار کرتے ہیں جو قانون سازی پر قادر ومطلق ہے۔

"ملک" عربی زبان میں بادشاہی، اقتدار، اور حاکمیت اعلیٰ کے لئے ملک کا استعمال کیا گیا ہے، اسی لئے فرمایا گیا۔

۱۔ تبارک الّذی بیدہ الملک وھو علٰی کلّ شئی قدیر (الملک - ۱)

پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور جو ہر چیز پر قادر ہے۔

۲۔ الم تعلم انّ اللہ لہٗ ملک السمٰوات والارض (البقرہ - ۱۰۷)

کیا تم نہیں جانتے کہ زمین و آسمان کی بادشاہی صرف خدا کے لئے ہے۔

۳۔ لہٗ ملک السمٰوٰت والارض و اِلی اللہ ترجع الامور (الحدید۔ ۵)

وہی زمین و آسمان کا مالک ہے اور تمام معاملات اس کی طرف لوٹتے ہیں۔

۴ بیدہ ملکوت کل شیئٍ والیہ ترجعون (یٰس۔ ۸۳)

اس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اس کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔

۵۔ قل فمن یملک لکم من اللہ شیاً ان اراد بکم ضراً او اراد بکم نفعاً (الفتح۔ ۱۱)

کہو اگر اللہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو کون ہے جو اس سے تمہیں بچا سکے، یا اگر وہ تمہیں نفع پہنچانا چاہے (تو اسے کون روک سکتا ہے)۔

۶۔ قل اللھم مالک الملک، تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء، وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علیٰ کل شیئٍ قدیر۔

کہو، خدایا، ملک کے مالک، تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے ساری بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

قانونی حاکمیت:۔ قرآن پاک میں حکم، امر، سلطان، یہ ایسے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ قانونی اختیار اوامر و نواہی کی حدود متعین کرنے کا اختیار، انتظام و انصرام کا اختیار صرف اور صرف خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے۔

۱۔ ان الحکم الا للہ (الانعام۔ ۵۷)

اللہ کے سوا کسی کو فیصلے کا اختیار نہیں۔

۲۔ مالھم من دونہٖ من ولیّ ولا یشرک فی حکمہٖ احداً (الکہف۔ ۲۶)

بندوں کے لئے اس کے سوا کوئی ولی اور سرپرست نہیں، اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

۳- للّٰہ الامر من قبل ومن بعد (الروم - ۴)

اللہ ہی کے ہاتھ میں اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔

۴- یدبّر الامر من السماء إلی الارض (السجدہ - ۵)

آسمان سے زمین تک دنیا کا انتظام وہی کرتا ہے۔

۵- یقولون ھل لنا من الامر من شیئ، قل إن الامر کلہ للّٰہ۔

وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اختیار میں بھی کچھ ہے؟ کہو سارا کا سارا اختیار اللہ ہی کا ہے۔

۶- ابصر بہ واسمع مالھم من دونہ من ولیّ ولایشرک فی حکمہ احداً

کمال درجے کا دیکھنے اور سننے والا ہے۔ اس کے سوا بندوں کا کوئی ولی اور سرپرست نہیں۔ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

۷- ان اللہ یحکم مایرید (المائدہ - ۱)

بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔

۸- واللّٰہ یحکم لامعقّب لحکمہ۔

اللہ فیصلہ کرتا ہے اور کوئی اس کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے۔

انسانوں کی اس بستی کے لئے ایسی ہستی ہی حقیقی و قانونی حاکمیت کے کام سرانجام دے سکتی ہے۔ جو علیم و خبیر ہو، خالق و رازق ہو، مالک و حاکم ہو، حکیم و مختار ہو۔ تاکہ اپنی مخلوقات کی جبلتوں اور صلاحیتوں کے مکمل علم کے بعد ان کے لئے ضابطہ اور قانون بنا سکے۔ ایسی ہستی کا قانون حقیقی اور اٹل ہوگا کیونکہ اسے ابدی حقیقتوں کا علم ہے۔ اور خالق ہونے کے سبب وہ اپنی مخلوقات کی پیدائش میں مضمر حکمتوں سے آگاہ ہے، اور یہ وہی ذات ہو سکتی ہے جو ہر چیز پر قادر ہو۔

انسانی فکر نے حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کو خدائی اختیارات دے دیئے۔ یہی اختیارات انسانوں کے ہاتھوں میں آئے تو دنیا شر اور فساد کی آماجگاہ بن گئی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب

یہ اختیار صرف اور صرف خدا تعالیٰ کا حق تسلیم کیا جائے تاکہ خود غرضی اور نفسانی خواہشات سے پاک انسانی مساوات کا علمبردار معاشرہ تعمیر کیا جائے جہاں انسان انسان کا خدا بننے کا دعویدار نہ ہو، اور اس پوری کائنات سے ہم آہنگ ہو کر اسی بارگاہ میں سرِ نیاز جھکا دیا جائے تاکہ کائنات کی ابدی حقیقتوں میں خلل واقع نہ ہو، اور یہ کرہ ارض اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتوں سے بہرہ ور ہو سکے۔

گذارش

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، جو کہ ایک عرصہ سے اسلامی تحقیق کے سلسلہ میں پیرس (فرانس) میں مقیم ہیں، حدیث قدسی سے متعلق مطبوعہ کتابوں اور مقالات کے (بزبان انگریزی، جرمن۔ اُردو وغیرہ) متلاشی ہیں۔ قارئین میں سے کسی کو اس ضمن میں کچھ معلومات ہوں تو از راہ کرم پروفیسر موصوف کو پتہ ذیل پر براہ راست مطلع کریں یا مدیر فکر و نظر سے رابطہ قائم کریں۔

DR MUHAMMAD HAMEEDULLAH 4 RUE DE TOURNON 75006 PARIS, FRANCE